قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلّغوا عنی ولو اٰیۃ (رواہ البخاری)

سلسلۂ تبلیغ ۵۸

وعظ

بار اول ۳۳۰۰

مہمات الدعاء

(دعا سے متعلق اہم امور)

حصہ اوّل

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی

مولانا خلیل احمد تھانوی

شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ دار العلوم الاسلامیہ

کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

فون کامران بلاک: ۵۴۲۲۲۱۳ — ۴۴۸۰۶۰

فون پرانی انارکلی: —— ۷۳۵۴۷۲۸ ——

صفر ۱۴۲۰ھ

جون ۱۹۹۹ء

یہ وعظ حضرت والاؒ نے ۲ صفر ۱۳۲۹ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں تقریباً دو گھنٹے بیٹھ کر "بیان تنبیہات متعلقہ دعاء" کے موضوع پر بیان فرمایا۔

مولوی نور حسین صاحب پنجابی نے اسے قلم بند فرمایا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوات عبدیت جلد اول کا وعظ دوم ملقب بہ

مہمات الدعاء

کا

حصہ اول

الحمدللہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلامضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم.

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم. قال اللہ تعالی: (آیت) وقال ربکم ادعونی استجب لکم. ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین[1].

(اور تمہارے پروردگار نے فرما دیا ہے مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا اور جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے)

---

(۱) المومن آیت: ۶۰

تمہید

اس آیت کے مضمون ہی سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ آج کا مقصود وعظ بیان تنبیہات متعلقہ[۱] دعاء ہے اور شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ ہم تو دعا کیا کرتے ہیں اور اس کی ضرورت وغیرہ کو بھی جانتے ہیں پھر کیوں تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ تنبیہ تو اس امر[۲] میں ضروری ہے جس کو جانتا نہ ہو یا کرتا نہ ہو۔ سو ضرورت تنبیہ کی یوں ہے کہ باوجود جاننے اور کرنے کے بھی جب دعا کے بارے میں تغافل[۳] برتا جاتا ہے یعنی اس کی ضروری آداب و شرائط سے بے پروائی کی جاتی ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ جانی ہوئی چیزوں سے بھی بڑھ کر کوئی قوی حجاب[۴] ہے کیونکہ مجہولات میں تو صرف جہل حجاب[۵] ہے کہ اس کا رفع[۶] ہونا سہل[۷] ہے اور جانی ہوئی چیز میں جب ایسا معاملہ کیا جائے تو وہ حجاب زیادہ سخت ہوگا اور ہر چند کہ یہ تغافل اور قلب کا حاضر نہ ہونا سب عبادت میں قبیح ہے مگر دعا میں اقبح[۸] ہے۔

مقصود دعاء

وجہ یہ کہ عبادات میں گو اصل مقصود معنی ہے مگر تاہم ایک درجہ میں صورت بھی مقصود ہے۔ بخلاف دعا کے کہ اس میں صرف معنی ہی معنی مقصود ہے اور وہ نیاز و افتقار و انکسار و خشوع قلب[۹] ہے جب یہ بھی نہ ہوا تو وہ دعا کیا ہوئی، بیان

---

(۱) دعا سے متعلق باتوں پر متنبہ کرنا ہے (۲) کام میں ضروری ہے (۳) لاپروائی ہوجاتی ہے (۴) بڑی رکاوٹ ہے (۵) جن چیزوں کو آدمی جانتا نہ ہو تو ان کے کرنے میں جہالت رکاوٹ ہے (۶) دور کرنا (۷) آسان (۸) اگرچہ یہ غفلت اور دل کا حاضر نہ ہونا ہر عبادت میں برا ہے مگر دعا میں بہت ہی برا ہے (۹) وہ اللہ سے اپنی ضرورت کے اظہار عاجزی اور نیازمندی کو ظاہر کرتے ہوئے گڑگڑا کر مانگنے کا نام دعا ہے

اس کا یہ ہے کہ مثلاً نماز ہے کہ قرآن[1] سے اس میں علاوہ مقصود معنوی یعنی توجہ الی اللہ کی صورت بھی مراد[2] اور مطلوب ہے کہ اس کے قیود ظاہری سے مفہوم[3] ہوتا ہے مثلاً وضو، جہت قبلہ، وقت، تعین رکعات وغیرہ، اب اگر کوئی شخص بغیر حضور قلب کے رکوع و سجود وغیرہ شرائط سے نماز پڑھ لے تو گو مقصود معنوی توجہ الی اللہ اس میں نہیں ہوئی مگر فقیہ عالم یہی حکم دے گا کہ فرض ادا ہو گیا اس سے ثابت ہوا کہ صورت بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے اور اس کی تحقیق سے صحت صلوۃ کا فتویٰ صحیح ہوا اس تقریر سے ان بے دینوں کا یہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو کہا کرتے ہیں کہ صاحب دل تو حاضر نہیں پھر نماز کیا پڑھیں معلوم ہوا کہ علاوہ حضور قلب کے کہ معنی اور حقیقت ہے نماز کی یہ صورت ظاہری رکوع سجود بھی مقصود ہے۔

دوسری مثال

دوسری نظیر لیجیے۔ روزے سے مقصود معنوی قوت بہیمیہ کا توڑنا اور مغلوب کرنا مطلوب[4] ہے۔ مگر با ایں ہمہ[5] اگر کوئی شخص سحری کو ایسا پیٹ بھر کھائے کہ افطار تک اس کو بھوک نہ لگے تو اس صورت میں قوت بہیمیہ تو کچھ بھی نہیں ٹوٹی مگر روزے کی چونکہ ظاہری صورت پوری ہو گئی ہے روزہ صحیح ہو گیا۔

---

(۱) دلائل سے (۲) نماز کا مقصود تو اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہے لیکن اس کی مطلوبہ ہیئت بھی ضروری ہے کہ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونے کو نماز نہیں کہتے (۳) یہ بات ظاہری قیدوں وضو، اور قبلہ کیطرف منہ کرنے وغیرہ سے سمجھ میں آتی ہے (۴) روزہ کا مقصود حیوانی قوتوں کا توڑنا ہے جس کی وجہ سے آدمی گناہ میں مبتلا ہوتا ہے (۵) ان سب کے باوجود

تیسری مثال۔

تیسری نظیر اور لیجیے زکوۃ کہ مقصود معنوی اس سے اغناء مساکین[۱] ہیں مگر باایں ہمہ[۲] اس کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص وقت معین ہے جس سے مقصودیت صورت[۳] ایک درجہ میں یہاں بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ صرف اغناء تو ان امور پر موقوف نہیں[۴]۔

دعاء کی حقیقت

لیکن دعا میں نہ کسی وقت کی شرط نہ زبان عربی کی شرط نہ کسی خاص جہت کی شرط نہ کوئی مقدار معین نہ وضو وغیرہ کی قید اس میں صرف عاجزی نیازمندی اپنی احتیاج کا اظہار اپنے مولیٰ کے آگے بس یہ کافی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہاں صورت پر بالکل نظر نہیں معنی ہی معنی مقصود ہیں۔ پس اب یہ صرف زبانی دعا کی آموختہ سا رٹا ہوا پڑھ دیا نہ خشوع نہ خشیت نہ دل میں اپنی عاجزی تصور یہ خالی از معنی دعا کیا ہوئی[۵] اس بے توجہی کی مثال تو ایسی ہوئی جیسا کوئی شخص کسی حاکم کے ہاں عرضی دینا چاہے اور اس طور پر عرضی پیش کرے کہ حاکم کی طرف پیٹھ[۶] کرے اور منہ اپنا کسی دوست یار کی طرف کرکے اس عرضی کو پڑھنا شروع کرے دو جملے پڑھ لیے۔ پھر یار دوست سے ہنسی مخول[۷] کرنے لگے پھر دو جملے پڑھ دیے اور ادھر مشغول ہوگئے۔

اب سوچ لینا چاہیے کہ حاکم کی نظر میں ایسی عرضی[۸] کی کیا قدر ہو سکتی

---

(۱) غریبوں کا مال دار کرنا (۲) مگر اس سب کے باوجود (۳) اس سب سے صورت کا ضروری ہونا یہاں بھی معلوم ہوتا ہے (۴) اس لیے کہ مال دار کرنے کا انحصار صرف ان کاموں پر نہیں (۵) بس ایسی دعا جو سبق کی طرح رٹی ہوئی پڑھ دی جائے نہ اس میں اللہ کا خوف نہ گڑگڑا کر التجا ہو نہ اپنی عاجزی کا تصور یہ بے معنی دعا ہے (۶) پشت (۷) مذاق (۸) درخواست

ہے بلکہ الٹا یہ شخص قابل سزا ٹھہرایا جائے گا بس یہی معاملہ ہے دعا کا دعا میں جب تک کہ پورے طور پر قلب[1] کو حاضر نہ کرے گا اور عاجزی اور فروتنی کے آثار[2] اس پر نمایاں نہ ہوں گی۔ وہ دعا۔ دعا نہیں خیال کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو قلب کی حالت کو دیکھتے ہیں۔

ما بروں را ننگریم و قال را ... ما دروں را بنگریم و حال را
ناظر قلبیم گر خاشع بود ... گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

(ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن اور حال کو ہم دل کو دیکھنے والے ہیں۔ اگر عاجزی وفروتنی کرنے والا ہو اگرچہ اس کا قول عاجزی وفروتنی کرنے والا نہ ہو)

حدیث شریف میں ہے: **ان اللہ لا ینظر الی صورکم ولکن ینظر الی قلوبکم** (اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے لیکن تمہارے قلوب کو دیکھتے ہیں)

تفسیر آیت وجواب اشکالات

اور آیت "**انی وجهت وجهی**" الخ (میں اپنے دل کو متوجہ کرتا ہوں) میں وجہی[3] سے بھی مراد یہی وجہ قلب ہے ورنہ بر تقدیر وجہ ظاہری کے خداوند تعالیٰ کا ذو جہت ہونا لازم آئے گا[4]۔ کیونکہ معنی تو یہی ہیں کہ میں نے اپنی وجہ[5] کو خدا کی طرف کیا۔ اور ظاہر ہے کہ وجہ ایک خاص سمت میں ہوگا۔ تو کیا ذات منزہ[6] اسی سمت میں ہوگی یہ تو محال[7] ہے عقلاً اور شرعاً کیونکہ وہ قیود سے

---

(۱) دل (۲) خود سپردگی کے آثار (۳) اپنے چہرے کو پھیرتا ہوں سے مراد دل کا متوجہ کرنا ہے (۴) وجہی سے ظاہری چہرہ مراد لینے کی صورت میں اللہ پاک کا کسی ایک جانب ہونا لازم آتا ہے کہ چہرے کو اس جانب پھیرتا ہوں اس لیے یہاں ظاہری چہرے کا پھیرنا مراد نہیں بلکہ دل کا متوجہ کرنا مراد ہے کہ اللہ پاک جہات سے منزہ ہے (۵) اپنے چہرے کو (۶) اللہ کی پاکیزہ ذات (۷) ناممکن ہے

منزہ[۱] ہے چنانچہ **اینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ** (جس طرف منہ کرلو ادھر ہی اللہ تعالیٰ کا رخ ہے) اس کی شرعی دلیل ہے اور اس نفی جہت و تنزہ عن القیود[۲] سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ذات باری میں تشخص اور تعین نہیں ہے تو وجود باری کا انکار لازم آئے گا اس لیے کہ بغیر تشخص و تعین کے تو کسی شے کا وجود محض ہے جیسا کہ بعض کے کلام سے متوہم[۳] ہوتا ہے کیونکہ بدون تشخص اور تعین کے تو کسی شے کا وجود خارجی[۴] محال ہے البتہ اس کی ذات کے لائق تشخص و تعین ہے کہ ہم اس تشخص و تعین کی حقیقت و کنہ کا ادراک نہیں کرسکتے[۵]۔

شبہ اور اس کا جواب

اور اگر شبہ ہو کہ جیسے وجہ کے لیے جہت ہونا ضروری ہے[۶] ایسے ہی قلب[۷] کی بھی تو کوئی جہت[۸] ہوگی وہی اشکال یہاں لازم آئے گا۔ تو جواب یہ ہے کہ قلب سے مراد یہ مضغۂ صنوبری[۹] نہیں بلکہ قلب ایک لطیفہ غیبی ہے مجردات۔ سے اور ہر چند کہ بعض متکلمین کا اس میں اختلاف ہے کہ مجردات کا وجود ہے یا نہیں مگر محققین صوفیہ کا یہ مکشوف[۱۰] ہے کہ بعض اشیاء مجردات سے ہیں مگر حادث ہیں ذاتاً بھی اور زماناً[۱۱] بھی اور یہی فرق ہے درمیان صوفیہ اور حکماء کے کیونکہ حکماء مجردات کو صرف ذاتاً حادث مانتے ہیں اور زماناً قدیم[۱۲] مانتے

---

(۱) اللہ جہات کی قیدوں سے پاک ہے (۲) کسی ایک جانب کی نفی اور قیدوں کے پاک ہونے سے (۳) سمجھ میں آتا ہے (۴) خارج میں موجود ہونا ناممکن ہے (۵) اللہ کی ذات میں تشخص بھی ہے اور تعین بھی ہے لیکن ہم اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتے البتہ ہمارے جب تشخص اور تعین نہیں کہ جہات کا محتاج ہو (۶) چہرے کے لیے کسی جانب کا ہونا ضروری ہے (۷) دل (۸) جانب (۹) گوشت کا ٹکڑا نہیں (۱۰) بعض صوفیاء کو اس بات کا کشف ہوا ہے (۱۱) تغیر ہونے کے باوجود ذات اور زمانے دونوں کے اعتبار سے ختم ہونے والی ہیں (۱۲) زمانے کے اعتبار سے ہمیشہ سے مانتے ہیں

ہیں اور متکلمین کے پاس نفی مجردات کی جبکہ وہ زمانا بھی حادث ہوں کوئی دلیل سالم[۱] نہیں۔

دل کی حقیقت

اور یہ مضمون کے قلب سے مراد ایک لطیفہ غیبی ہے اور مجرد عن المادہ[۲] ہے یہ ٹکڑا گوشت کا مراد نہیں جو کہ ذو جہت[۳] ہے علاوہ کشف کے ہمارے ایک محاورے سے بھی جو کہ روزمرہ بولا جاتا ہے بالکل واضح ہوجاتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہمارا دل اس وقت بازار میں ہے اور فرض کیجیے کہ ہم اسوقت بازار میں موجود نہ ہوں اور مقصود محاورات سے حقائق علمیہ پر استدلال کرنا نہیں محض تنویر اور تقریب[۴] ہے۔ غرض یہ بات پورے طور پر ثابت ہوگئی کہ دعا میں حضور اور خشوع ہی مقصود ہے۔ اگر بے اس کے بھی کسی کی دعا قبول ہوجائے تو اس کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ خدا تعالیٰ کا مجھ پر ابتدائی احسان ہے دعا کا اثر نہیں یہ ایک تمہید تھی مضمون دعا کی۔

مضمون آیت

اب آیت کا مضمون سنیے، اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اس آیت میں بڑے اہتمام سے دعا کا مضمون بیان فرمایا ہے چنانچہ شروع میں یہ تصریح فرمائی کہ وقال ربکم (تمہارے رب نے فرمادیا) حالانکہ پہلے سے معلوم تھا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے مگر پھر اس کو اس لیے ظاہر فرمایا کہ اس کی تاثیر نفس میں قوی[۵] ہوجائے اور

---

(۱) دلیل مضبوط نہیں (۲) مادہ سے خالی ہے (۳) سمت رکھنے والا (۴) علمی حقائق پر دلیل پکڑنا نہیں بلکہ ذہن کو حقیقت سے قریب کرنا ہے (۵) نفس پر اس کا اثر زیادہ ہو

مضمون ما بعد کی وقعت دلوں[1] میں زیادہ ہو پھر لفظ "ربکم" (تمہارا رب) ارشاد فرمایا اس میں بوجہ اظہار ربوبیت[2] گویا اشارہ ہے دعا کے قبول کرلینے کا اس طور پر کہ چونکہ ہم ہمیشہ سے تمہاری پرورش کرتے آئے ہیں حتی کہ بدون[3] تمہاری درخواست کے بھی کی ہے تو کیا تمہاری عرض کو درخواست کرنے پر بھی قبول نہ کریں گے نہیں ضرور قبول کریں گے۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود　　لطف تو ناگفتہ ما مے شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف و کرم ہمارے بلا کہے ہوئے سنتا تھا)

آیت اذ انشاءکم من الارض واذ انتم اجنة فی بطون امھاتکم لخ۔ (جبکہ تم کو زمین سے پیدا کیا تھا جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے) میں اسی تربیت بے درخواست کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد پیدائش کے بعد کی حالت قابل غور ہے کہ یہ حالت ایسی تھی کہ کسی قسم کی تمیز اور شعور اس وقت تک نہ ہوا تھا اس حالت میں اگر تمام دنیا کے حکماء سقراط بقراط وغیرہ اکٹھا ہو کر صرف اتنی ہی تدبیر کرنا چاہئیں کہ بچہ دودھ پینا سیکھ جائے تو ہرگز وہ قیامت تک اس پر قادر نہیں ہوسکتے یہ اسی قادر ذوالجلال کی حکمت اور اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے بچہ کو دودھ چوسنا سکھایا حکماء کہیں گے کہ یہ خود طبیعت کا فعل ہے مگر جبکہ خود وہ طبیعت ہی کو بے شعور[4] مان چکے ہیں تو ایسے پر حکمت کاموں کا اس کی طرف منسوب کرنا بے شعوری[5] نہیں تو اور کیا ہے تیسرا اہتمام "ربکم" کی اضافت ہے گویا فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ہیں تم ہم سے مانگو اور اسی کی نظیر دوسری آیت میں اضافت ہے۔ (ولو یواخذ اللہ

---

(۱) بعد میں آنے والے مضمون کی اہمیت دلوں میں پیدا ہو (۲) رب ہونے کے اظہار سے (۳) بغیر (۴) ناسمجھ (۵) ناسمجھی

الناس) الی قولہ (کان لعبادہ بصیراً) (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے ظلم کے سبب دارو گیر فرماتے (تا) وہ اپنے بندوں پر بصیر ہے) حالانکہ یہاں عباد ماخوذین[۱] کا ذکر ہے مگران کو بھی اپنی طرف مضاف فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ کیا رحمت ہے۔

علمی و تفسیری فائدہ

اس آیت کے متعلق ایک فائدہ علمیہ تفسیریہ سمجھنے کے قابل ہے کہ آدمیوں کے مواخذے کی تقدیر پر تمام دواب کے ہلاک کو کیسے مرتب فرمایا[۲] تو وجہ اس کی یہ ہے کہ سب چیزیں انسان ہی کے لیے پیدا ہوئی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے **ھوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً**[۳] یعنی تمام چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے ہی لیے پیدا کی ہیں خواہ ان کا نفع بلاواسطہ تم کو پہنچے یا واسطہ در واسطہ پس چونکہ انسان کے لیے ہی سب چیزیں پیدا کی گئی ہیں اس لیے انسان اگر گناہ پر ہلاک کیا جاتا تو دوسری چیزیں بھی اس لیے ہلاک کی جاتیں کہ جب وہی نہ رہا جس کے لیے یہ سامان تھا تو پھر اس سامان کی کیا ضرورت جب آدمی نہ ہوں تو پھر خیمے ڈیرے و دیگر سامان اسباب کس کام کے، البتہ یہ شبہ اور باقی رہ گیا کہ بروں کو تو ان کے برے کام کی سزا ملتی ہے اور نیک آدمیوں کو کیوں ہلاک کیا جاتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھے آدمی قدر قلیل[۴] ہوتے ہیں اور انسان کی ضرورتیں تمدن و آسائش کے متعلق اس کثرت سے ہیں کہ تھوڑے آدمی ہرگز

---

(۱) اگرچہ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جن سے مواخذہ کیا جاتا ہے (۲) آیت میں یہ کیوں فرمایا کہ اگر ہم گناہوں پر مواخذہ کرتے تو سب جانوروں کو بھی ہلاک کردیتے اس کی وجہ (۳) البقرہ (۴) تھوڑے کم ہوتے ہیں

ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ پھر اگر بروں کے بعد نیک زندہ رہتے تو ان کو جینا و بال ہوجاتا ان کے لیے یہ مرنا ہی مصلحت ورحمت ہوتا۔ اس سے بڑھ کر مقدمہ دعا میں اس آیت میں یہ اہتمام فرمایا کہ دعا نہ کرنے والوں کے واسطے ترہیب فرمائی کہ "ان الذین یستکبرون" الخ (بلاشک جو لوگ تکبر کرتے ہیں) اس موقع پر ایک فائدہ علمیہ کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوجائے کہ یہ ترہیب اعراض عن الدعاء[1] پر ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو مادہ دعا[2] کا اور ترہیب میں مادہ عبادت کا، چنانچہ: یستکبرون عن عبادتی (میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں) یستکبرون عن دعائی (میری دعا سے سرتابی کرتے ہیں) نہیں ہے اور تطابق[3] ضروری اس لیے یا تو دعا بمعنی عبادت لیا جائے یا عبادت بمعنی دعا قرار دیا جائے احتمال دونوں فی نفسہ برابر ہیں مگر چونکہ کلام مجید کا سمجھنے والا رسول اللہ ﷺ سے کوئی شخص زیادہ نہیں ہوسکتا کیونکہ مخاطب اول آپ ہی ہیں اس لیے اس کی تعیین کے لیے حدیث کو دیکھا گیا سو آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی جس سے ثابت ہوا کہ دعا اپنے معنی پر ہے اور عبادت سے مراد یہاں خاص دعا ہے ان اہتماموں سے دعا کی شان و عظمت کس درجہ ظاہر ہوتی ہے۔

دعاء کا امتیاز

ایک خصوصیت خاص دعا میں اور عبادات سے زیادہ یہ ہے کہ اور جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لیے ہوں تو عبادت نہیں رہتیں مگر دعا ایک ایسی چیز

---

(۱) دعا نہ کرنے پر یہ ڈانٹ ہے (۲) یعنی اُدعونی ہے (۳) دونوں جگہ مطابقت ضروری ہے

ہے کہ یہ اگر دنیا کے لیے ہی ہو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے مثلاً مال مانگے دولت مانگے یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے جب بھی ثواب کا مستحق بنے گا بر خلاف اور عبادات کے کہ اگر ان میں دنیوی حاجت مطلوب[۱] ہو تو ثواب نہیں ملتا۔ چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اگر طبیب نے کسی کو رائے دی کہ تم آج دن کا کھانا نہ کھاؤ اگر کھایا تو ضرر[۲] دے گا اس نے کہا لاؤ آج روزہ ہی رکھ لیں پس روزہ رکھ لیا تو اس کو خالص روزہ کا ثواب نہ ملے گا کیونکہ اس کو در اصل روزہ رکھنا مقصود نہیں۔ ایسے ہی کوئی شخص مسافرت میں اس نیت سے مسجد کے اندر اعتکاف کرلے کہ سرائے کے کرایہ وغیرہ سے بچوں گا تو اس کو خالص ثواب اعتکاف کا نہ ملے گا مگر دعا میں یہ بات نہیں چاہے کتنی ہی حاجتیں دنیوی مانگو مگر پھر بھی ثواب ملے گا اور دعا میں یہ خصوصیت اس لیے ہے کہ دعا سراسر نیاز مندی ہے اور عجز و انکسار اور اظہار عبدیت[۳] و احتیاج، اور یہ دنیا کے مانگنے کے وقت بھی متحقق ہے اور نیاز مندی[۴] خود ایک بڑا محبوب عمل ہے۔

تکبر کا نقصان

کیونکہ جہاں نیاز مندی ہوگی وہاں کبر[۵] نہیں رہے گا اور کبر اور خودی بھی بڑا مبغوض[۶] اور بڑا حائل ہے چنانچہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ **الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری** (بڑائی میری چادر اور عظمت میرا ازار[۷] ہے) رداء اور ازار مراد یہ کہ دونوں میرے وصف خاص ہیں کہ کوئی دوسرا

---

(۱) دنیوی ضرورت طلب کرے (۲) نقصان (۳) اس لیے کہ دعا کے معنی ہیں کہ اپنے کو حقیر اور ضرورت مند ظاہر کرتے ہوئے اپنی بندگی کا اظہار کرے (۴) عاجزی (۵) تکبر (۶) تکبر اور خودی کا اظہار اللہ کے غضب کا باعث ہے (۷) تہبند

ان دو وصفوں کا مدعی محق[۱] نہیں ہوسکتا اور حضرت بایزید بسطامیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ منام[۲] میں جناب باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ دلنی علی اقرب الطرق الیک (مجھے اپنی طرف آنے کا قریب تر طریق بتلادیجیے) جواب ارشاد ہوا دع نفسک وتعال (اپنی خودی کو چھوڑ اور آجا) حافظ شیرازیؒ نے اس مضمون کو کیا خوب فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

(اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے تو اپنے حجاب خودی کو اے حافظ درمیان سے ہٹادے)

تو درو گم شو وصال این است و بس　　　گم شدن گم کن کمال این است و بس

(تو اس میں فنا ہوجا یہی وصال کافی ہے اپنا گم ہونا بھول جا انتہائی کمال یہ ہے)

فناء الفناء کی حقیقت

حاصل یہ کہ اپنی خودی کو مٹاؤ یہاں تک کہ اس مٹانے پر بھی نظر نہ رہے۔ یعنی اس صفت فنا پر بھی نظر نہ رہے اور اس کا نام اصطلاح میں فناء الفناء[۳] ہے اور اس کو شاعرانہ مضمون نہ سمجھا جائے کہ مٹانے کو بھی مٹاؤ اس کے نظائر[۴] تو روز مرہ واقع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ فناء الفناء کی توضیح[۵] اس مثال سے اچھی طرح ہوسکتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی دلربا معشوق ہو اور عاشق اس کے خیال میں مستغرق[۶] ہو اس حالت میں اس عاشق کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں خیال کررہا ہوں کسی کو یاد کیجیے اس یاد کی طرف ذرا بھی ذہن نہیں جاتا۔ آدمی سوتا ہے مگر اس وقت یہ خبر نہیں ہوتی کہ میں سوتا ہوں اور اگر یہ خبر ہوجائے تو وہ سوتا ہوا نہیں

(۱) کوئی دوسرا ان دونوں کا سچا دعوے دار نہیں ہوسکتا (۲) نیند میں (۳) مٹانے کا مٹانا (۴) مثالیں (۵) وضاحت (۶) خیال میں ڈوبا ہوا ہو

ہے اور ان احوال عالیہ[1] کو سن کر یہ نا امیدی نہ چاہیئے کہ بھلا ہم کو یہ دولت کب میسر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی کا فضل بڑا وسیع ہے اس کو کچھ دشوار نہیں۔

تو مگو مارا بدوں شہ بار نیست　　　با کریماں کارہا دشوار نیست

(یہ مت کہو کہ بھلا اس دربار تک ہماری رسائی کہاں ہے کیونکہ کریموں پر کوئی کام دشوار نہیں)

صحبت شیخ کا فائدہ

البتہ ایسے ماحول کے لیے صحبت شیخ کی ضرورت ہے اور صحبت وہ چیز ہے کہ دیکھو انڈا کیا چیز ہے سفیدی اور زردی کے سوا اس میں کچھ بھی نہ تھا مگر مرغی کے سینے سے اس میں جان آگئی تو کیا صحبت کاملین کی اس سے بھی گئی گذری اور یہ وسوسہ بھی نہ ہو کہ صحبت تو ایسی چیز ضرور ہے مگر خود وہ لوگ کہاں ہیں جنکی صحبت میں یہ برکت ہو تو یقین کے ساتھ سمجھو کہ اب بھی اللہ کے نیک بندے اس برکت کے موجود ہیں۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان است

(اب بھی ابر رحمت درفشاں ہے خم اور خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے)

دل سے میدان طلب میں آنا چاہیئے نری روکھی سوکھی آرزو سے کام نہیں چلتا، صدق طلب[2] ہونی چاہیئے اور کوشش۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

اگرچہ عالم میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر یوسف علیہ السلام کی طرف دوڑنا یعنی کوشش

(۱) بلند حالات کو سن کر (۲) سچی طلب

تو کرنی چاہیے)

یوسف علیٰ نبینا علیہ السلام کو کیسا اپنے مولیٰ پر بھروسہ تھا کہ باوجود دروازے بند ہونے کے دوڑے اور کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے دروازے بھی کھولدیے اگر صدق دل سے طلب اور کوشش ہو تو مقصود ملنے کی یقینی امید ہے۔ بعض صوفیہ نے بطور تاویل اور اعتبار کے نہ بطور تفسیر اس آیت ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموات والارض[1] الخ (اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو نکلو) میں امر فانفذوا کو امر تعجیزی نہیں لیا بلکہ تکلیفی اسی مضمون کے مناسب سمجھا ہے۔

ناجائز کام کے علاوہ ہر دعا عبادت ہے

غرض حاصل یہ ہے کہ دعا کا خلاصہ نیازمندی ہے اور دعا خواہ کسی قسم کی دینی ہو یا دنیوی ہو مگر ناجائز امر کے لیے نہ ہو سب عبادت ہے خواہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی، حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا تعالیٰ سے مانگا کرو۔

ایک بزرگ رو رہے تھے کہ کسی نے پوچھا کیوں روتے ہو فرمایا بھوک لگی ہے اس نے کہا کیا بچے ہو کہ بھوک سے روتے ہو انہوں نے فرمایا کہ جب مولیٰ کی یہی مرضی ہو کہ میں بھوک سے رووں تو پھر استقلال[2] کیوں اختیار کروں۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دیں ۔۔۔ خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(اگر شاہنشاہ دیں مجھ سے طمع کرنے کا خواہش مند ہو تو میں قناعت پر خاک ڈال دوں گا)

---

(١) الرحمن آیت ٣٣ (٢) پھر میں مستقل مزاج کیوں رہوں

نالم این نالہا خوش آیدش　　　　از دو عالم نالہ و غم بایدش

(میں اس واسطے نالہ کرتا ہوں کہ اس کو نالے پسند آتے ہیں دو عالم سے نالہ و غم اس کو چاہیے)

بعض اہل لطائف کا قول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ اب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ میں مرض کی شکایت کا اظہار کروں تب فرمایا رب انی مسنی الضر[1] الخ (اے میرے پروردگار مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے) ورنہ یہ اظہار بے صبری کی وجہ سے نہ تھا اگر بے صبری ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کی یوں تعریف نہ فرماتے انا وجدناہ صابرا نعم العبد[2] الخ (ہم نے اس کو صابر پایا اچھا بندہ ہے)۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

(خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا بات مختصر چاہیے تطویل کلام سے کیا فائدہ والسلام)

غرض ان کاملین کی نظر خدا تعالیٰ کی رضا پر ہوتی ہے اپنا حظ ظاہری یا باطنی[3] کچھ مقصود نہیں ہوتا جس میں خدا تعالیٰ راضی ہوں وہی کرنے لگتے ہیں۔

گفت معشوقے بعاشق اے فتا　　　　تو بغربت دیدہ بس شہرہا
پس کدامی شہر ازانہا خوشتراست　　　　گفت آں شہرے کہ دروے دلبراست
ہر کجا یوسف رخ باشد چو ماہ　　　　جنت است او گرچہ باشد قعر چاہ
باتو دوزخ جنت است اے جانفزا　　　　بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(کسی معشوق نے عاشق سے پوچھا کہ تم نے سیاحت میں کونسا شہر پسند کیا ہے اس نے جواب دیا سب سے عمدہ وہ شہر ہے جہاں محبوب کی زیارت ہو جہاں محبوب

---

(۱) الانبیاء آیت ۸۳ (۲) سورہ ص آیت ۴۴ (۳) باطنی اور ظاہری کوئی مزہ مقصود نہیں ہوتا

ہر وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو، اے محبوب بے تمہارے جنت بھی دوزخ ہے اور تمہارے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

عشاق کی شان

عاشقوں کی کچھ اور ہی شان ہے حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کی حکایت ہے کہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو اس واسطے ذکر کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں فاذکرونی اذکرکم[1] (پس تم مجھ کو یاد کیا کرو میں تم کو یاد رکھوں گا) یعنی احوال و کیفیات باطنی پر نظر نہ تھی دیکھیے محققین کی تو یہاں تک نگاہ ہے کہ خدا کے نام اور احکام میں کیفیات باطنی تک کا قصد[2] نہ کریں۔

حصول علم کی غرض فاسد

اور افسوس آج کل لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ تو دین تحصیل دنیا کے لیے پڑھتے ہیں کوئی دست غیب تلاش کرتا پھرتا ہے۔ حالانکہ اس میں جواز تک بھی نہیں کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو کچھ ملتا ہے وہ حرام ہے کیونکہ جن مسخر ہوجاتے ہیں اور وہ لوگوں کا مال چرا چرا کا عامل کو دیتے ہیں یا اگر اپنا اپنا لائیں تب بھی مجبور ہو کر لاتے ہیں۔ ایسا ہی تسخیر قلوب[3] کا حال ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے جو مال دیا جاتا ہے وہ طیب خاطر[4] سے نہیں دیا جاتا۔ مغلوب الرائے و مضطر[5] ہو کر دیتا ہے اور اگر کسی عمل میں جواز بھی ہو تب بھی ایسے اغراض کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام کی بے قدری کرنا اور بھی بے ادبی ہے اور احادیث میں جو سورہ واقعہ

---

(۱) البقرہ آیت ۱۵۲ (۲) ارادہ (۳) کسی کے دل کو مسخر کرنا کہ جو کام چاہے وہ وہی کرے (۴) خوش دلی (۵) دوسرے کی رائے کے تابع اور بیقرار ہو کر دیتا ہے

کا پڑھنا وغیرہ آیا ہے وہ دنیا کو معین[1] دین بنانے کی غرض سے جو کہ دین ہی ہے۔ کاش یہ لوگ بجائے ان اعمال کے دعا کیا کرتے اگر مقصود حاصل ہوجاتا تو بھی مطلب کا مطلب اور ثواب کا ثواب اور اگر نہ ہوتا تو بھی دعا کا ثواب کہیں گیا ہی نہ تھا۔

مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ عمل میں ایک اور خرابی ہے کہ دعا سے تو پیدا ہوتی ہے عاجزی اور فروتنی اور عمل سے پیدا ہوتا ہے۔

دعویٰ

عامل جانتا ہے کہ بس ہم نے یہ کردیا اور وہ کردیا۔ مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادیؒ کا لوگ ذکر کرتے ہیں کہ فرماتے تھے کہ اگر صاحب نسبت عمل کرے تو نسبت سلب ہوجاتی ہے، اس کی یہی وجہ ہے کہ عامل کو خدا پر توکل نہیں رہتا اور عجب[2] پیدا ہوجاتا ہے اور یہ منافی ہے نسبت مع اللہ کے۔ یہ قدر ضروری بیان تھا دعا کے مہتم بالشان ہونے کا اب دعا سے لوگوں کے تغافل[3] کے اسباب کا بیان باقی رہا۔ انشاء اللہ تعالیٰ کسی موقع پر وہ ہوجائے گا۔

ختم شد

معروضہ

قارئین سے التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماویں کہ ناشر اور اس کی اولاد کی کوشش دینیہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں اور مقبولان حق کے ساتھ محشور فرماویں اور تمام زندگی بعافیت پوری فرماویں۔ آمین بحرمۃ حضور سید المرسلین ﷺ۔

---

(۱) دنیا کو دین کے لیے مددگار بنانے کی غرض سے ہے (۲) اپنی بڑائی (۳) دعا سے لوگوں کی لاپرواہی کے اسباب کا بیان باقی ہے وہ اسی وعظ کے دوسرے حصہ میں حضرت نے بیان کیا جو اس کے ۱۶ روز بعد حضرت نے اسی مسجد میں ۱۶ صفر سنہ ۱۳۳۹ھ کو بیان کیا ۱۲ (عقیل)